دینی مدارس کے ذرائع آمدنی اور دہشت گردی

ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

دینی مدارس کی فضاء نہایت ہم آہنگی کی فضا ہوتی ہے، اس میں خودغرضی کے بجائے ایثار و بے غرضی، رشوت کے بجائے اعانت، قانونی تعلق کے بجائے روحانی تعلق، فکر معدہ کے بجائے فکر معاد اور خدمتِ نفس کے بجائے خدمت دین کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور ایک خاص اسپرٹ کے تحت کام کرنے کی وجہ سے ان کو حالات کی تلخ کامیوں میں حلاوت اور کلفتوں میں راحت کا احساس ہوتا ہے۔ زیر نظر مضمون دینی مدارس کے حقیقی خدوخال کو بیان کرنے کے لیے تحریر کیا گیا ہے۔ ——— (ادارہ)

اس وقت ملک میں دینی مدارس کے خلاف ماحول تیار کرنے کی پوری کوشش کی جارہی ہے، ایسی تنظیمیں جن پر ہزاروں مسلمانوں کا خون ہے اور جو کھلے عام اپنے کارکنوں کو آتشیں اسلحہ کی تربیت دے رہی ہیں، نیز اخبارات اور الکٹرانک ذرائع ابلاغ میں کھلے عام تلواروں اور ترشولوں سے لیس اور بندوقوں سے نشانہ لیتی ہوئی ان کارکنوں کی تصویریں آرہی ہیں، وہ دینی مدارس کو دہشت گردی کے مراکز قرار دینے میں کوئی حیاء محسوس نہیں کرتے اور حکومت اور اس کے ذمہ دار ترین نمائندے نہایت ہی ڈھٹائی کے ساتھ ان الزامات کو دہرا رہے ہیں، حقائق کو جانے اور الزامات کی تحقیق کیے بغیر ایسی باتیں کرنا کم سے کم ذمہ دارانِ حکومت کو زیب نہیں دیتا، لیکن بدقسمتی سے حکومت مدعی اور جج کے دوہرے فرائض ادا کرنے کی کوشش کررہی ہے۔

مدارس کے بارے میں اس الزام کی حقیقت سمجھنے کے لیے چند پہلوؤں سے غور کرنے کی ضرورت ہے، تعلیمی مواد، ماحول اور واقعات وتجربات — مدارس کے نصاب میں عام طور پر تین طرح کے مضامین شامل ہوتے ہیں۔ اول خالص اسلامی علوم، اس میں قرآن، حدیث، فقہ، عقیدہ، اسلام کے اُصولِ قانون اور تفسیر وحدیث سے متعلق اُصول وقواعد داخل ہے، دوسرے عربی زبان سے متعلق علوم، اس سے عربی گرامر یعنی نحو وصرف، عربی ادب اور اُصولِ بلاغت مراد ہیں، تیسرے وہ مضامین جو انسان کی عام ضروریاتِ زندگی سے متعلق ہیں، ان میں منطق، فلسفہ، حساب، انگریزی، تاریخ اور مقامی زبان وغیرہ مضامین پڑھائے جاتے ہیں، ان میں سے دوسری اور تیسری قسم کا مواد زبان وادب یا عام عملی زندگی سے متعلق ہے۔

خالص اسلامی علوم سے متعلق جو کچھ پڑھا جاتا ہے اسی سے ذہن وفکر کی تعمیر اور عمل کی تحریک متعلق ہے، پھر اسلامی علوم میں اُصولِ قانون، اُصولِ حدیث اور اُصولِ تفسیر بجائے خود مقصود نہیں، بلکہ ان سے وہ قواعد وضوابط معلوم ہوتے ہیں

جن کی روشنی میں قرآن کی تفسیر اور حدیث کی تشریح کی جاتی ہے، حدیث نقل کرنے والوں کو پرکھا جاتا ہے، قرآن و حدیث سے اعتقادات اور عملی زندگی کے احکام کس طور سے مستنبط کیے جاتے ہیں؟ ان پر بحث کی جاتی ہے، گویا یہ علوم قرآن وحدیث اور فقہ وعقیدہ کے لیے وسائل وذرائع اور کلید کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے ان علوم کا تعلق بھی سماجی زندگی میں انسان کے رویہ اور طریقۂ کار سے نہیں ہے، اب جو چار مضامین باقی رہ گئے، ان میں قرآن وحدیث اصل ہیں اور فقہ وعقیدہ اس کا نتیجہ اور اس سے مستنبط مسائل، عقیدہ سے مراد وہ باتیں ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب وضمیر سے ہو اور جس کے ماننے پر کسی شخص کا مسلمان ہونا موقوف ہو، اعضاء وجوارح سے اس کا تعلق نہ ہو، اللہ ایک ہے، اللہ ہی نے کائنات کی اس بستی کو بسایا اور تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا ہے، اس نے انسان کی ہدایت اور رہبری کے لیے ہر عہد، ہر علاقہ اور ہر زبان میں اپنے رسول اور دوست کو کتاب ہدایت دے کر بھیجا ہے۔ انسان نے وقتاً فوقتاً اس میں اپنی طرف سے ملاوٹیں کردی ہیں، اس طرح اس کتاب ہدایت کا آخری ایڈیشن سرزمین عرب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید کی شکل میں نازل ہوا، اس لیے قرآن اللہ کی آخری کتاب اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول ہیں۔

انسان کو دنیا میں نیکی کا حکم دیا گیا ہے، برائی سے روکا گیا ہے، گویا وہ امتحان کی حالت میں ہیں، اس لیے ایک دن یہ دنیا ختم کردی جائے گی اور آخرت کا نظام قائم ہوگا، جس میں تمام انسانوں کو بے کم وکاست اس کی اچھائی اور برائی پر جزاء وسزا دی جائے گی۔ توحید، رسالت اور آخرت یہ تینوں باتیں اسلامی عقیدہ کی بنیاد اور اساس ہیں۔ غور کیجیے کہ اس میں کون سی بات انسان کو تشدد پر اُکسانے والی ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آخرت میں جواب دہی کا احساس ایسی بات ہے جو انسان کو ظلم وزیادتی اور دہشت گردی سے روکتی ہے اور پابند قانون شہری بناتی ہے۔

''فقہ'' سے مراد وہ احکام ہیں جو انسان کی عملی زندگی سے متعلق ہوں، ان کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، اول عبادات یعنی وہ افعال جو بندہ اور خدا کے تعلق کو ظاہر کرتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی۔ دوسرے پرسنل لاء سے متعلق قوانین، جن کو آج کل ''احوال شخصیہ'' اور فقہاء اسلام کی قدیم اصطلاح میں ''مناکحات'' کہا جاتا ہے، اس عنوان کے تحت وہ حقوق وفرائض آتے ہیں جو قرابت داری کی بناء پر ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں۔ نکاح، طلاق و تفریق، مہر، عدت، ثبوتِ نسب، والدین، اولاد اور بیوی کا نفقہ، میراث اور وصیت وغیرہ احوال شخصیہ میں شامل ہیں۔ تیسری قسم ان قوانین کی ہے جو مالی لین دین سے متعلق ہیں جیسے خرید وفروخت، آجر اور مزدور، مالک اور کرایہ دار کے احکام، ہبہ، قرض وغیرہ ان قوانین کو ''معاملات'' کہتے ہیں۔ چوتھے ملک کے انتظامی قوانین ہیں، اس شعبہ میں امیر کا انتخاب، عدلیہ کی تشکیل، جرائم پر سزائیں اور امن وامان قائم رکھنے کی تدبیریں وغیرہ سے متعلق احکام ذکر کیے جاتے ہیں، ان قوانین کا تعلق مسلم حکومتوں سے ہے، عام مسلمانوں سے ان کا تعلق نہیں۔ پانچویں امن وجنگ اور قومی تعلقات سے متعلق قوانین ہیں، اس قانون کی روح بقاء باہم کا اُصول ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، جنگ سے گریز کیا جائے، امن وآشتی قائم رکھی جائے اور صلح کی فضاء بنائی جائے اور ہر صورت میں انسانی جان ومال اور عزت وآبرو کے احترام کو ملحوظ رکھا

جائے۔ قانون کا یہ چوتھا اور پانچواں شعبہ ایسا ہے کہ خود فقہاء نے صراحت کی ہے کہ اس کا تعلق مسلمان حکومتوں سے ہے، نہ کہ عام مسلمانوں سے، عام مسلمانوں کو ہرگز اس بات کا حق نہیں کہ وہ ان قوانین کو اپنے ہاتھ میں لے لیں کہ اس طرح لاقانونیت کا مزاج پیدا ہو جائے گا۔ پھر احکام فقہیہ کی تفصیل بھی اس ترتیب سے ملتی ہے، سب سے زیادہ عبادات، پھر احوال شخصیہ اور معاملات اور ان سے کم انتظام ملکی اور تعلقات بین ملکی سے متعلق قوانین، ان میں کہیں دہشت گردی کے مضمون کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں، دہشت گردی لاقانونیت ہے اور فقہ اسلامی خلوت سے جلوت اور نجی زندگی سے سماجی اور قومی زندگی تک ہر مرحلہ پر مسلمانوں کو پابند قانون شہری اور امن پسند انسان بناتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا فقہ وعقیدہ کا اصل سرچشمہ قرآن وحدیث ہے۔ قرآن اللہ کی بھیجی ہوئی کتاب ہے اور حدیث محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات اور معمولات ہیں۔ قرآن کی ابتداء بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے ہوتی ہے، جس کے معنی ہیں، اس اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، گویا قرآن کا آغاز ہی رحمتوں اور مہربانیوں کے ذکر سے ہوتا ہے، جو اُمت مہربان اور رحم دل خدا کی پرستار ہوگی، ضرور ہے کہ وہ خود بھی جذبۂ رحم سے معمور ہو، خدا کی ایسی تصویر کہ اس کے ہاتھوں میں تلوار اور نیزہ ہے، منہ سے آگ کے انگارے نکل رہے ہیں، اس کے بال پھن مارتے ہوئے زہریلے سانپ سے آراستہ ہیں اور وہ خود منہ کھولے ہوئے شیر پر براجمان ہے، خدا کی یہ تصویر صحیح ہے یا غلط؟ اس سے قطع نظر ایسے خدا پر یقین سے انسان میں وحشت پیدا ہوتی ہے اور طاقت کے فلسفہ پر اس کا یقین قائم ہو جاتا ہے، قرآن ایک ایسے خدا کا تصور پیش کرتا ہے جو شفقت ورحمت کے اتھاہ جذبات رکھتا ہو۔ پھر قرآن کی پہلی سورت سورۂ فاتحہ ہے، یہ سات مختصر آیتوں پر مشتمل ہے، جس میں خالق کائنات کی تعریف بھی ہے، جس میں بندہ اور خدا کے تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے اور اخیر میں خدا سے دعا مانگی گئی ہے، اس سورت کی پہلی تین آیتوں کا ترجمہ اس طرح ہے:

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، جو تمام عالموں کا پالنے والا ہے، بہت مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے، بدلہ کے دن کا مالک ہے۔''

غور کریں کہ پہلی آیت میں خدا کے رب العالمین یعنی تمام عالم کا رب ہونے کا ذکر کیا گیا ہے اور اس طرح انسانی اخوت کا پیغام دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے رشتہ سے تمام انسان بھائی بھائی اور گویا ایک ہی کنبہ کے افراد ہیں۔ دوسری آیت میں خدا کے مہربان اور رحم دل ہونے کی بات کہہ کر بتایا گیا ہے کہ رحم دلی اور درگذر ایک قابل تعریف وصف ہے۔ تیسری آیت میں آخرت کی جواب دہی کے احساس کو اُبھارا گیا ہے، جس سے انسان میں قانون کی اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور غیر آئینی طریقۂ کار سے بچنے کا خیال، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اگر انسان اپنے جرم کو دنیا کی آنکھوں سے چھپالے تب بھی آخرت کی پکڑ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا۔ یہ تمام نکات وہ ہیں، جو انسان کو دہشت گردی سے بچاتے ہیں، نہ کہ دہشت گردی میں مبتلا کرتے ہیں۔

دہشت گردی کے عام طور پر تین عوامل ہوتے ہیں نسلی، مذہبی اور معاشی، جب کوئی ایک گروہ نسلی اعتبار سے اپنے

آپ کو اونچا اور دوسروں کو نیچا سمجھنے لگتا ہے تو اس سے حقیقت سمجھے جانے والے لوگوں میں محرومی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے، اسلام نے اس کا یہ علاج کیا ہے کہ جیسے اس نے خدا کے ایک ہونے کا اعلان کیا، اسی طرح تمام انسانیت کی وحدت کو بھی پوری قوت کے ساتھ بیان فرمایا، قرآن کہتا ہے:

﴿یاأیها الناس اتقوا ربکم الذي خلقکم من نفس واحدة﴾ (نساء:۱)

''اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے''۔

پس، قرآن پوری انسانیت کو ایک کنبہ اور ایک خاندان قرار دیتا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نے اس کو اور زیادہ واضح کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی عرب کو غیر عرب پر اور گورے کو کالے پر محض رنگ وخون کی بنیاد پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، اس طرح گویا نسلی جارحیت اور اس کی بنیاد پر پیدا ہو جانے والی دہشت گردی کی جڑ ہی کاٹ دی گئی، مذہب کے معاملہ میں قرآن کا نقطۂ نظر بالکل واضح ہے کہ اس میں کسی بھی طرح کا جبر واکراہ نہیں:

﴿لا إکراه في الدین قد تبین الرشد من الغي﴾ (البقرۃ:۲۵۶)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی عملی زندگی میں قرآن کے اس اُصول کو برت کر دکھایا۔ مدینہ میں یہودی عددی اعتبار سے معمولی درجہ کی اقلیت تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر اسلام کی دعوت پیش کی، لیکن کبھی ان پر کوئی جبر روا نہیں رکھا، ان کی بار بار کی بدعہدیوں کے باوجود ان کی عبادت گاہ اور تعلیمی نظام وغیرہ میں کوئی مداخلت نہیں کی، ان کو اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی پوری آزادی رہی، مکہ فتح ہونے کے بعد مشرکین مکہ اور ان کے سردار پوری طرح مسلمانوں کے قابو میں تھے لیکن آپ نے عام معافی کا اعلان فرما دیا اور کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور نہیں کیا، مذہبی آزادی کا اسلام میں اس قدر پاس ولحاظ ہے کہ اگر کسی مذہب میں ماں اور بہن سے نکاح کی اجازت ہو اور وہ مسلمان حکومت میں رہتا ہو، تب بھی حکومت کو اس کے مذہبی معاملات میں مداخلت کی اجازت نہیں۔ مسلمانوں کے لیے شراب حرام ہے اور مسلمانوں کے لیے اس کی خرید وفروخت بھی حرام ہے، لیکن مسلمان ملک میں جو غیر مسلم رہتے ہوں اگر ان کے مذہب میں شراب ممنوع نہ ہو تو انھیں اپنے ہم مذہب لوگوں سے شراب بیچنے کی اجازت ہے، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دوسرے مذاہب کے ساتھ مسلمانوں کو کس قدر ذہنی رواداری اور درگذر کی تعلیم دی گئی ہے، جو مذہب اپنے زیر حکومت رہنے والوں کے ساتھ اس فراخ دلی کا رویہ سکھاتا ہو، وہ کیا مسلمان اقلیت کو غیر مسلم اکثریت کے ساتھ مذہب کے معاملہ میں جبر وتشدد کی تعلیم دے سکتا ہے؟

انسان پر وہ ماحول بھی گہرا اثر ڈالتا ہے، جس میں اس کی تربیت ہوتی ہے، جیسے گرم ماحول چیزوں کو گرم اور سرد ماحول چیزوں کو سرد کر دیتا ہے، اسی طرح انسان کے اخلاق وعادات اور اس کے مزاج ومذاق پر بھی ماحول کا گہرا اثر ہوتا ہے، جو شخص راہزنوں اور لٹیروں کے درمیان رہتا ہے اور ہر وقت لاٹھی، تلوار، خنجر، بھالے اور بندوق، رائفل دیکھنے کا عادی ہو تو اگر وہ خود تشدد نہ کرے تو کم سے کم تشدد کو دیکھنے کی صلاحیت اس میں پیدا ہو جاتی ہے اور جو شخص با اخلاق، وضع

دار، نرم خو اور انسانیت دوست لوگوں کے درمیان زندگی گذارتا ہو، ممکن نہیں کہ وہ نرم خوئی، شرافت سے کوئی حصہ نہ پائے، اس کی زبان، چال، ڈھال، طرزِ تخاطب، طبیعت میں رچاؤ اور رکھ رکھاؤ سے وہ بخوبی پہنچانا جاتا ہے، اس لیے کسی کی شخصیت اور مزاج کے مطالعہ کے لیے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے کہ کس ماحول میں اس کی نشو ونما ہوئی ہے؟

دینی مدارس کے ماحول کو ہمیں اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھنا چاہیے، درس گاہوں میں انحراف اور طلبہ میں بغاوت کے جو محرکات پائے جاتے ہیں، اگر تجزیہ کریں تو وہ بنیادی طور پر تین ہیں۔ ایک تو سیاسی جماعتوں کی طلبہ تنظیمیں، دوسرے اساتذہ وطلباء کے درمیان محاذ آرائی اور مخاصمانہ جذبات، تیسرے لڑکوں اور لڑکیوں کا اختلاط — آج کل تمام بڑی درس گاہوں میں طلباء کی یونین قائم ہیں، یہ تعمیری کام تو برائے نام کرتی ہیں، لیکن ان کے اشارہ پر تخریب اور فساد کا ماحول زیادہ پیدا ہوتا ہے، نوجوانی کی عمر بغاوت کی عمر ہے، اجتماعیت اور آزادی اس جذبۂ بغاوت کو دو آتشہ کر دیتی ہے، اس کے نتیجہ میں ہڑتال، احتجاج، جلسہ جلوس کالجوں، یونی ورسٹیوں میں روزمرہ کا معمول بن گیا ہے۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کے موقع سے ایک وقتی ضرورت کے تحت جنگ آزادی کے قائدین اس بات پر مجبور ہوئے کہ یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے طلباء کو آزادی کی لڑائی میں شریک کیا جائے، کیوں کہ نوجوان نسل کے گرم خون کے بغیر کوئی انقلابی تحریک کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوتی، اس میں شبہ نہیں کہ طلباء کی شمولیت کی وجہ اس تحریک کو بڑی قوت حاصل ہوئی، لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائی اور پرتشدد احتجاج ہماری تعلیم گاہوں کے مزاج میں داخل ہوگیا، تعلیم وتحقیق کا کام یکسوئی اور ایک طرح کی عزلت گزینی اور خلوت نشینی کو چاہتا ہے، جب کہ سیاسی مہم جوئی، دوڑ دھوپ اور تگ ودو کی متقاضی ہوتی ہے، اس لیے تعلیم گاہوں میں سیاسی مزاج ومذاق کا داخل ہوجانا تعلیمی ماحول کے لیے فائدہ مند سے زیادہ نقصان دہ ہے۔ آزادی کے بعد مزید ستم یہ ہوا کہ سیاسی طالع آزماؤں نے اپنی اپنی جماعتوں میں اسٹوڈنٹس ونگ قائم کیے، اس وقت اکثر یونی ورسٹیوں میں دائیں اور بائیں بازو کی فکر کے حامل طلباء کے گروپ موجود ہیں اور یونین کے الیکشن میں پبلی سٹی، کنوینگ کے علاوہ تشدد، مار دھاڑ اور قتل واغوا وغیرہ کے واقعات اسی طرح پیش آتے ہیں، جیسا کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ کے الیکشن میں، یہ ملک کے بہی خواہوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

دینی مدارس اب تک بحمد اللہ ایسی تحریکات سے پاک ہیں، عام طور پر ان مدارس میں طلباء کی یونین قائم نہیں ہے، کچھ چھوٹی موٹی انجمنیں محض تقریر وتحریر کی مشق کے لیے مدارس میں ہوتی ہیں، جن کی باگ ڈور انتظامیہ اور اساتذہ کے ہاتھوں میں ہوتی ہے، یہ انجمنیں ہفتہ وار تقریر وتحریر کے پروگرام منعقد کرتی ہیں، انجمن کے تحت مختلف گروپ بنادیئے جاتے ہیں، جو دس بارہ طلبہ پر مشتمل ہوتا ہے، یہ اخلاقی موضوعات پر تقریروں کی مشق کرتے ہیں، یا چند صفحات کے مضامین لکھتے ہیں، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، والدین کے حقوق، عورتوں کے حقوق، استاذ کے حقوق، قرآن مجید کی عظمت، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، علم کی اہمیت، اتحاد واتفاق اور خدمت خلق، عام طور پر ان ہی موضوعات پر تقریریں اور تحریریں لکھی جاتی ہیں، نہ مختلف افکار کی ترجمانی کرنے والے طلباء گروپ، نہ الیکشن کی مہم جوئیاں، نہ احتجاجی

جلسے اور ریلیاں، اس لیے ان میں تعمیری رجحان پنپتا ہے نہ کہ تخریبی۔

اس وقت عصری درس گاہوں میں صورتِ حال یہ ہے کہ انتظامیہ اساتذہ اور طلباء کے درمیان ایک طرح کی مقابلہ آرائی کی فضا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تعلیم وتعلم کے پیشہ سے تقدس جاتا رہا اور خودغرضی نے اس کی جگہ لے لی، اساتذہ کسبِ زر کے لیے پڑھاتے ہیں، یہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ بہت سی دفعہ ایم۔فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریوں کو منظور کرنے کے لیے بیش قیمت تحائف یا رقوم کا مطالبہ کیا جاتا ہے، غیر حاضری اور دیر حاضری عام ہے، نصاب نامکمل ہوتا ہے اور ایسی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ طلبہ ٹیوشن پڑھنے پر مجبور ہو جائیں، انتظامیہ اساتذہ کی تقرری اور طلباء کے مسائل کو حل کرنے میں رشوت حاصل کرتی ہے، گویا کسبِ معاش کا ایک کاروبار ہے، جس میں ہر شخص جائز اور ناجائز طور پر زیادہ سے زیادہ سیم وزر کے حصول کے لیے بے چین ہے، ایسے خودغرضانہ ماحول میں احترام وتقدس کی فضاء کیسے باقی رہ سکتی ہے؟ نہ انتظامیہ میں اساتذہ وطلبہ کی ہمدردی وبہی خواہی ہے، نہ اساتذہ میں فرض شناسی اور طلبہ کے ساتھ شفقت ومحبت ہے، نہ طلبہ میں اساتذہ کے تئیں احترام وعقیدت کے جذبات ہیں، ایسا نہیں کہ تعلیم گاہوں میں سارے ہی لوگ ایسے ہیں، لیکن کوئی حقیقت پسند اور حقیقت آگاہ اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ ایک قابل لحاظ تعداد ایسے لوگوں کی موجود ہے۔

دینی مدارس کا ماحول اس لحاظ سے نہ صرف غنیمت ہے، بلکہ ایک قابل تقلید نمونہ ہے، انتظامیہ کا حال یہ ہے کہ وہ در در پہنچ کر اپنے طلبہ کے لیے چندے جمع کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ وہ پیسے پیسے بھیک مانگ کر اساتذہ وطلباء کی ضرورت پوری کرتے ہیں تو بے جا نہ ہو، خود ان کی تنخواہیں معمولی ہوتی ہیں، گو اس معاملہ میں اب کسی قدر بے اعتدالی ہونے لگی ہے، لیکن مدارس کے منتظمین کی اکثریت آج بھی متوسط سے کم درجہ کی زندگی گذارتی ہے، بعض مثالیں تو ایسی بھی ملتی ہیں کہ ان کی کوششوں سے مدرسہ کی اسی پرشکوہ اور راحت رساں عمارتیں بن گئیں جو نگاہوں کو خیرہ کرتی ہیں، لیکن خود ان کی زندگی آج بھی خس پوش مکانوں میں گذرتی رہی اور وہ دنیا سے اس حال میں گئے کہ ان کے ورثہ کے حصہ میں پانچ ہزار روپے بھی نہ آسکے۔

اساتذہ کا معاملہ تو اس سے بھی زیادہ قابل رشک ہے، ایسی بے شمار مثالیں ملیں گی کہ ایک عالم چالیس، چالیس سال سے درس دے رہا ہے، اس کی زبان پر علم بولتا ہے، اسی خدمت میں اس کے بال سفید ہو گئے اور اس کی ہڈیوں کے گودے پگھل گئے، لیکن اس کی تنخواہ سرکاری محکموں کے چپڑاسی سے بھی کم ہے، اس کے باوجود نہ زبان پر شکوہ وشکایت ہے، نہ دل میں حرص وطمع ہے، نہ دوسروں کی دولت وثروت کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکتی ہیں، ان کے سینے طلبہ پر شفقت ومحبت کے جذبات سے معمور ہیں اور دین کی اس خدمت پر اللہ کے شکر وسپاس سے ہر بُن مو لبریز ہے، طلبہ سے کچھ لینے کا سوال ہی نہیں، بلکہ ان مدارس میں طلباء کی اکثریت اس لائق ہی نہیں ہوتی کہ وہ کچھ پیش کرسکے، بلکہ اکثر اوقات یہی اساتذہ اپنی قلیل تنخواہوں میں سے حسبِ توفیق ان غریب لڑکوں پر کچھ خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کے تعاون کے لیے کوشاں رہتے ہیں، عام طور پر مدرسہ کے اُصول کے مطابق اساتذہ کی ڈیوٹی چھ گھنٹہ کی ہوتی ہے، لیکن کم سے کم سال کے

آخری تین مہینوں میں اونچے درجہ کے اساتذہ دس دس گھنٹے پڑھاتے ہیں، کیوں کہ مقررہ نصاب کے اعتبار سے وقت کم ہے اور اس لیے خارجی اوقات میں پڑھا کر اس نصاب کو پورا کیا جاتا ہے، تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو۔

طلبہ کو اساتذہ سے جو محبت ہوتی ہے اور اساتذہ و منتظمین کا جو احترام وہ کرتے ہیں، ایسے احترام کی مثال شاید ہی مل سکے، یہ ایک حقیقت ہے کہ بال بچے اپنے ماں باپ کا بھی نہ اس درجہ احترام کرتے ہیں اور نہ ایسی والہانہ خدمت۔ خدمت اور احترام کا یہ جذبہ مدارس کے طلباء میں نسلاً بعد نسل گویا میراث کے طور پر چلا آرہا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمت کے معلم اول تھے، قرآن نے سب سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جس حیثیت کو ذکر کیا ہے، وہ یہی معلم ہونے کی حیثیت ہے، صحابہ آپ کا اس طرح احترام کرتے کہ جب آپ کوئی گفتگو کرتے، تو کمال توجہ کی وجہ سے ایسا لگتا ہے کہ ان کے سروں پر پرندے بیٹھے ہوئے ہیں، یہی حال بعد کے ادوار میں رہا، امام ابوحنیفہؒ اپنے استاذ حماد کے گھر کی طرف پاؤں پھیلانے سے بھی گریز کرتے، مدارس میں محبت واحترام اور خدمت واکرام کی یہ روایت بڑی حد تک اب بھی باقی ہے، کیوں کہ طلبہ گویا اس بات کا عقیدہ رکھتے ہیں کہ استاذ کی ناراضگی کے ساتھ ان کا علم بافیض نہیں ہوسکتا۔

جہاں تعلیم گاہ کے ان تینوں عناصر انتظامیہ، اساتذہ اور طلباء کے درمیان تصادم، ٹکراؤ اور منافست کی کیفیت ہوگی، وہاں اختلاف وتشدد کا ذہن پروان چڑھے گا اور تخریب ودہشت گردی کا مزاج پیدا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ آج نکسلائیٹ تحریک میں بہت بڑی تعداد تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ہے، جہاں ان تینوں طبقوں کے درمیان ہم آہنگی، ایثار اور محبت کی فضاء ہوگی، وہاں امن وسلامتی اور انسانیت نوازی کا مزاج پیدا ہوگا، اسی لیے دینی درس گاہوں کے فضلاء ایسی تشدد آمیز تحریکوں میں نہیں دیکھے جاتے کہ ان کی تعلیم ہی ہم آہنگی اور ایثار کے ماحول میں ہوئی ہے۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے اختلاط کا ماحول بھی بعض اوقات مجرمانہ سوچ کو جنم دیتا ہے اور بعض مفسد لوگ اپنی ہوس نفس کو پورا کرنے کے لیے اغوا اور تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہیں، جب ایک دفعہ انسان تشدد اور لاقانونیت کی وادی میں قدم رکھ دیتا ہے، تو پھر بعض اوقات اس راہ میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے، جہاں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ایک جگہ ہوں اور لڑکیوں کے لیے اپنے گیسو، بازو اور ٹانگوں کو کھلا رکھنا درس گاہی ثقافت کا ایک حصہ بن گیا ہو، وہاں جسارت انگیز طبیعتوں کا مشتعل ہوجانا چنداں عجیب نہیں، چنانچہ ہمارے ملک میں کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں طلبہ اور طالبات کے درمیان غیر قانونی تعلق، اغواء، زنا بالجبر اور بعض دفعہ آبروریزی کے ساتھ قتل کے کتنے ہی واقعات پیش آتے رہتے ہیں، ان سب سے مزاج میں تشدد اور جرم کی طرف میلان اور منصوبہ بندی کے ساتھ زبردستی اپنی ہر خواہش کی تکمیل کا ذہن بنتا ہے، یہی دہشت گردی کی اصل اور اس کی بنیاد ہے۔

دینی مدارس میں بحمد للہ اب تک مخلوط تعلیم کا تصور نہیں، لڑکوں کی تعلیم گاہیں الگ ہیں، لڑکیوں کے مدارس الگ ہیں، لڑکیوں کے مدارس میں معلمات پڑھاتی ہیں، یا پردہ کے پورے اہتمام کے ساتھ مرد اساتذہ درس دیتے ہیں، اسی لیے دینی مدارس کے طلباء یا فضلاء کی طرف سے اغوا یا اس طرح کے جرائم کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے گی۔ غرض جو منفی

اسباب درس گاہوں میں تشدد کی پرورش کرتے ہیں اور ان کی وجہ سے انجام کار بعض لوگ دہشت گردی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں، بحمد اللہ دینی مدارس ایسی باتوں سے پاک وصاف ہیں۔

اب ایک نظر ان مدارس کے روزمرہ کے ماحول اور معمولات پر بھی ڈالیے کہ ان ہی معمولات سے انسان کے فکر وعمل کا سانچہ تیار ہوتا ہے اور اس کے سلوک واخلاق کی عمارت بنتی ہے، ان مدارس کا عام معمول یہ ہے کہ صبح سے ایک ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اساتذہ وطلبہ بیدار ہوتے ہیں، عام طلبہ بھی اور خاص کر قرآن مجید حفظ کرنے والے طلبہ تلاوت قرآن میں مشغول ہوجاتے ہیں اور بہت سے اہل توفیق رات کی اس تنہائی میں خدا کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے اور تہجد ادا کرنے کی سعادت بھی حاصل کرتے ہیں، پھر صبح ہوتے ہی صبح سویرے سناٹے میں مؤذن کا نغمۂ توحید رس گھولتا ہے اور دوگانہ سنت ادا کرنے کے بعد فجر کی نماز ادا کی جاتی ہے، نماز فجر کے بعد مختلف مدارس کے نظام الاوقات کے لحاظ سے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تمام ہی طلبہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں، پھر ناشتہ کیا جاتا ہے اور ناشتہ کے بعد اسباق شروع ہوجاتے ہیں۔

اسباق کا یہ سلسلہ دو پہر تک چلتا ہے، پھر دوپہر کا کھانا اور کھانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ قیلولہ واستراحت، قریب دو بجے دن، ظہر کی اذان ہوتی ہے، طلبہ بیدار کیے جاتے ہیں اور اساتذہ وطلبہ وضو کر کے مسجد میں نماز ظہر ادا کرتے ہیں، ظہر کے بعد سے سہ پہر یعنی پانچ، ساڑھے پانچ بجے شام تک پھر اسباق کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس کے بعد عصر کی نماز پڑھی جاتی ہے، عصر اور غروب آفتاب کے درمیان موسم کے فرق کے ساتھ ایک گھنٹہ سے ڈیڑھ دو گھنٹہ کا وقفہ ملتا ہے، اس وقفہ میں کچھ لوگ چہل قدمی کرتے ہیں، کچھ لوگ اپنی روزمرہ کی ضروریات کے لیے بازار جاتے ہیں اور کچھ فٹ بال یا والی بال وغیرہ کھیلتے ہیں۔

ابھی سورج اپنی آنکھیں موندنے کے لیے تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ اساتذہ اور طلبہ بارگاہِ خداوندی میں حاضری کے لیے وضو کرتے ہیں، اِدھر سورج نے اپنی کرنوں کو سمیٹا، اُدھر مؤذن نے صدا لگائی اور سب نے نماز مغرب ادا کی، نماز کے بعد حسب توفیق سنت ونفل پڑھی، مغرب کے بعد ڈیڑھ تا دو گھنٹہ طلبہ اپنے اسباق کا مذاکرہ کرتے ہیں، مذاکرہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جماعت کا ذہین طالب علم استاذ کے پڑھائے ہوئے سبق کو دوہراتا ہے اور دوسرے طلبہ اس سے استفادہ کرتے ہیں، اساتذہ اس وقت آئندہ اسباق کے لیے مطالعہ میں مشغول ہوتے ہیں، پھر عشاء کی اذان ہوئی، نماز ادا کی گئی اور کھانے کا دسترخوان بچھا، سب نے کھانا کھایا، کھانے کے بعد پندرہ بیس منٹ چہل قدمی اور دوسری ضروریات کے لیے وقفہ دیا گیا اور پھر اساتذہ طلبہ آئندہ دن کے اسباق کے مطالعہ میں مصروف ہوگئے، اپنی اپنی قوت برداشت کے اعتبار سے گیارہ سے بارہ اور بعض حوصلہ مند رات کے ایک ڈیڑھ بجے اللہ کا ذکر کرتے ہوئے محوِ خواب ہوگئے۔

یہ ہے ان مدارس کے روزمرہ کا معمول، رہائش کے کمرے معمولی، اکثر مدارس میں طلبہ فرش خاک ہی پر اپنا بستر بچھا لیتے ہیں، بعض مدارس، بلکہ بہت سے مدارس میں تو درس گاہوں کے لیے بھی علاحدہ عمارت نہیں ہے اور رہائشی

کمروں میں ہی اوقات درس میں اسباق بھی پڑھائے جاتے ہیں، مدارس میں ان غریب طلبہ کے لیے عوامی تعاون سے کھانے اور دوسری ضروریات کا نظم کیا جاتا ہے، یہ کھانے اوسط سے کم درجہ کے ہوتے ہیں، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مدارس میں ایک بہت بڑی تعداد ایسے خاندانی پس منظر رکھنے والے طلبہ کی ہوتی ہے جو خطِ غربت سے نیچے زندگی گذار رہے ہوتے ہیں۔

یہ ماحول طلبہ میں تواضع، مسکنت، قناعت، ایثار و اخوت، اوقات کی پابندی، اللہ پر توکل اور بھروسہ کی زندگی گذارنے کا مزاج پیدا کرتا ہے، زیادہ سے زیادہ دولت اور عہدۂ وجاہ کی حرص کو کم کرتا ہے کہ یہی حرص وہوس انسان کو تشدد و دہشت گردی کے راستہ پر لے جاتی ہے، کوئی صاحب انصاف دیکھے کہ یہ ماحول انسان کو دہشت گرد بنائے گا یا امن و آشتی کا پیغمبر اور انسانیت کا علمبردار؟؟

پھر معاشی اعتبار سے ایک اور پہلو قابل غور ہے، ملک بھر میں لاکھوں کی تعداد میں مسجدیں ہیں، جن کو خطباء، ائمہ اور مؤذنین کی ضرورت ہوتی ہے۔ بچوں کی بنیادی دینی تعلیم اور اُردو زبان کی تعلیم کے لیے مکاتب کے معلم یا ٹیوٹر کی صورت میں ہزاروں ایسے افراد کی ضرورت ہوتی ہے، جو قرآن پاک اور اُردو کی تعلیم دے، ان سب کاموں کے لیے انھیں مدارس سے افراد مہیا ہوتے ہیں۔ مدارس سے تعلیم مکمل کرنے والے فارغین کی تنخواہیں گو کم ہوتی ہیں، لیکن ان کی ایسی ذہن سازی اور تربیت کی جاتی ہے کہ وہ دینی جذبہ کے تحت کم پیسوں میں کفایت شعاری کے ساتھ اپنی زندگی گزار لیتے ہیں، اس طرح مدارس کے ذریعہ سے انھیں افراد کے روزگار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا جو ان میں تدریس کا فریضہ انجام دیتے ہیں یا دوسری خدمتیں کرتے ہیں، بلکہ ایسی تعلیم بھی ان کو مہیا کی جاتی ہے کہ جس کے ذریعہ وہ ضروری حد تک روزگار حاصل کرسکیں، میں سمجھتا ہوں کہ ہر سال ہزاروں افراد ان مدارس سے فارغ ہوتے ہیں اور مسلمانوں کے مذہبی فرائض سے متعلق خدمت انجام دیتے ہیں، الحمدللہ انھیں فاقہ کشی کی نوبت نہیں آتی، چنانچہ اخبار میں ایسی خبریں تو آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں تعلیم یافتہ بے روزگار نے معاشی حالات سے تنگ آکر خودکشی کرلی، لیکن خدانخواستہ کسی عالم یا حافظ کے بارے میں ایسی افسوسناک خبر پڑھنے کو نہیں ملتی، یہ تو ہے ان مدارس کی معاشی افادیت کا پہلو۔

دوسرا اہم پہلو تعلیمی ہے۔ اس وقت ہمارے ملک میں خواندگی کی مجموعی شرح پچاس سے ساٹھ فیصد کے درمیان ہے، یہ تو کم ترین خواندگی کا معاملہ ہے، سند یافتہ پڑھے لکھے لوگوں کی شرح ظاہر ہے کہ اس سے بہت کم ہے، ان مدارس کے ذریعہ ایک بہت بڑی تعداد کی تعلیم وتربیت کا انتظام ہورہا ہے اور ایسے سند یافتہ فضلاء نکل رہے ہیں جو کم سے کم دو ملکی زبان اُردو اور مقامی اور دو مشرقی زبان عربی اور فارسی اور ایک حد تک انگریزی زبان پڑھے ہوئے ہوتے ہیں، دوسرے علوم ان کے علاوہ ہیں، اگر حکومت اپنے ہی اعداد وشمار کے مطابق انیس لاکھ افراد کی تعلیم کا انتظام کرے تو کس قدر وسائل درکار ہوں گے اور کیا ہماری حکومت جو چار، پانچ فیصد بھی تعلیم پر خرچ نہیں کرپاتی، ان اخراجات کی متحمل ہوسکتی ہے؟

پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ یہ مدارس کن طبقات تک علم کی روشنی پہنچاتے ہیں؟ ان لوگوں تک جن کے پاس نہ

مال وزر ہے، نہ تعلیم کا شعور ہے، نہ شہری تمدن ہے اور نہ آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے تہذیبی اور ثقافتی معیارات ہیں۔ آج کل جو لوگ اسٹیج پر مسلمانوں کو حصول تعلیم کا اُپدیش دیتے ہیں، ان کا اپنا حال یہ ہے کہ ان کی درس گاہوں میں غریب طلبہ اور ان کے اولیاء کے لیے زینہ پر قدم رکھنے کی بھی گنجائش نہیں، سرکاری اسکولوں کا حال یہ ہے کہ وہاں طلبہ کے لیے فرنیچر اور محفوظ دیواریں اور چھتیں بھی میسر نہیں ہیں، اسی لیے شاید ہی کوئی سرکاری عہدہ دار اور عوامی اداروں میں قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ارکان پارلیمنٹ واسمبلی کے لڑکے ولڑکیاں ان درس گاہوں میں زیر تعلیم ہوں۔ اس صورتِ حال کے پس منظر میں دیکھیے کہ یہ مدارس کیسا تعلیمی جہاد کر رہے ہیں اور کتنا عظیم کارنامہ ان کے ذریعہ سرانجام پا رہا ہے؟ ہمارے عصری تعلیم سے وابستہ بھائیوں کو چاہیے کہ اس مسئلہ کو فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھیں، بلکہ قومی اور ملکی مفادات کے پس منظر میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ مسئلہ پر غور کریں۔

تعلیمی اعتبار سے ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری یونی ورسٹیوں میں مشرقی زبانوں، عربی، فارسی، اردو کے جو شعبہ جات قائم ہیں، ان میں زیادہ تر طلبہ دینی مدارس کے فضلاء ہوتے ہیں۔ اگر مدارس سے ان شعبوں کو غذا نہ ملے تو خاص کر عربی اور فارسی کے شعبوں میں طلبہ کا دستیاب ہونا دشوار ہو جائے گا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ہماری یونی ورسٹیوں کے ان شعبوں میں جو طلبہ عصری درس گاہوں کے راستہ سے آتے ہیں، ان کی استعداد افسوس ناک حد تک سطحی ہوتی ہے اور یہی حال ایسے پس منظر رکھنے والے اساتذہ کا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ وہ نہایت مضحکہ خیز باتیں کہہ جاتے ہیں اور دینی مدارس کے معمولی فضلاء کے لیے بھی ایسی غلطیاں حیرت انگیز ہوتی ہیں۔

تعلیمی اعتبار سے یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اردو ٹیچرس اور اردو، فارسی و عربی اساتذہ کی ایک بڑی تعداد نے ان ہی دینی درس گاہوں میں نشو ونما پائی ہے اور تعلیم وتدریس کے اعتبار سے بھی یہی حضرات درس گاہوں میں ممتاز سمجھے جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس وقت اس ملک میں اردو زبان ان ہی دینی مدارس کے دم سے باقی ہے، ورنہ جس طرح معیشت اور روزگار سے اس کا رشتہ کاٹ دیا یا ہے، اردو ذریعہ تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، حیدرآباد (انڈیا) میں دارالترجمہ کو راتوں رات راکھ کا ڈھیر بنا دیا گیا اور تنگ نظر سیاست دانوں نے بیک جنبش قلم ملک کی واحد اردو یونی ورسٹی جامعہ عثمانیہ کی زبان تراش کر کے رکھ دی، اس اعتبار سے اردو کا وجود ختم ہو جانا چاہیے تھا، لیکن برصغیر پاک وہند میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کا ذریعہ تعلیم چونکہ اردو زبان ہی ہے، اس لیے اس نظام نے اردو کو نئی طاقت دی ہے۔ اس وقت ملک بھر میں اگر اردو کتابوں اور خریداروں کے اعداد وشمار جمع کیے جائیں تو ان میں نوے فیصد ان ہی مدارس کے فیض یافتہ قلم کاروں کے رشحاتِ فکر ہوں گے۔

غور کیا جائے کہ یہ بجائے خود کتنی بڑی علمی اور تعلیمی خدمت ہے اور ایک ایسی دیسی زبان کی حفاظت ہے جو ملک کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک سمجھی جاتی ہے اور جس کے خوب صورت مکالموں، جل ترنگ غزلوں اور کانوں میں رس گھولنے والے نغموں کا ہر سلیم الفطرت انسان رسیا ہے۔ کیا ایک قومی زبان کو زندہ و پائندہ رکھنا معمولی خدمت ہے؟

حکومت کو یہ فکر پریشان کیے ہوئے ہے کہ ان مدارس کے پاس اتنا فنڈ کیوں کر آتا ہے؟ اول تو لوگوں کو یہ محسوس کرنا چاہیے کہ ان مدارس کے حجم کے اعتبار سے ان کے اخراجات بہت معمولی ہوتے ہیں، دوسرے یہ اخراجات بڑی حد تک مسلمانوں کے مقامی تعاون سے پورے ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں جو لوگ زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور چرم قربانی کے نظام پر نگاہ رکھیں گے، ان کے لیے اس کو سمجھنا چنداں دشوار نہیں ہوگا، وہ اس طرح کہ ساڑھے باون تولہ چاندی پر زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے، اگر ملک میں مسلمانوں کی آبادی بیس کروڑ مان لی جائے اور فرض کیا جائے کہ پندرہ فیصد مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو گویا تین کروڑ مسلمانوں پر زکوٰۃ واجب ہوئی، مالی حیثیت کے اعتبار سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی مختلف مقدار ہوگی، لیکن اگر فی کس اوسطاً ایک ہزار روپے زکوٰۃ کا مانا جائے، تو سالانہ تین ارب روپے زکوٰۃ کے ہوں گے۔ صدقۃ الفطر، مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ادا کرتی ہے اور چونکہ اس کے لیے مخصوص اموالِ زکوٰۃ کا مالک ہونا ضروری نہیں، اس لیے تقریباً پچاس فیصد مسلمانوں کی طرف سے صدقۃ الفطر کی ادائیگی ہوتی ہے، اس وقت صدقۃ الفطر کی مقدار کم وبیش بیس روپیہ ہے، دس کروڑ افراد اگر فی کس بیس روپے ادا کر رہے ہیں تو یہ رقم بھی دو ارب ہوجاتی ہے، اس کے علاوہ اگر پچیس فیصد مسلمانوں کے بارے میں یہ مانا جائے کہ وہ قربانی دیتے ہیں اور اوسطاً ان کے چرم قربانی کی رقم فی کس سو روپے ہی مان لی جائے تو یہ رقم پانچ ارب ہوجاتی ہے۔

اس طرح عام صدقات وخیرات اور وقف کی آمدنی کے علاوہ دس ارب روپے زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور قربانی سے حاصل ہوتے ہیں، اجناس اور پھلوں میں دس فیصد اور پانچ فیصد بطور عشر جو ادا کیا جاتا ہے، نیز عمومی عطیات کی جو رقمیں ہوتی ہیں، وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اگر پورے ہندوستان وپاکستان کے مدارس کے اخراجات کو جمع کا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ وہ پانچ، چھ ارب سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ ان اعداد وشمار سے بآسانی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے مدارس کے اخراجات کو پورا کرنے میں خود مکتفی ہیں، انھیں بیرونی ملکوں کی طرف دیکھنے کی چنداں حاجت نہیں۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ یہ مدارس بیرونی ایجنسیوں سے تعاون حاصل کرتے ہیں اور ان کا چلنا بیرونی امداد پر منحصر ہے، بے خبری اور ناآگہی پر مبنی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس دستور وآئین کے پابند، امن پسند، انسانی اخوت ومحبت کے علمبردار ہیں۔ ہر طرح کی ظلم وزیادتی اور دہشت گردی کے مخالف، قوم وملک کے بہی خواہ ادارے ہیں اور ان کے دروازے سبھوں کے لیے کھلے ہوئے ہیں، جو بھی چاہے ان مدارس میں آکر ان کے شب وروز کے نظام کو دیکھ سکتا ہے بغیر دیکھے ہوئے اور بلا تحقیق مدارس کو بدنام کرنا اور ان پر دہشت گردی کا الزام رکھنا یقیناً کھلی ہوئی زیادتی اور بددیانتی ہے، اس لیے اہل مدارس کی طرف سے سرکاری عہدیداران، اربابِ صحافت اور ہمارے دیگر برادرانِ وطن کے لیے صدائے عام ہے کہ وہ بچشم سران مدارس کے نظام کو دیکھیں اور سچائی کے گواہ بنیں، نہ کہ جھوٹ اور بہتان کے پرچار کریں۔

☆☆☆